ISSN (Print): 2959-4391 ISSN (Online): 2959-4405

JOURNAL OF SOCIAL SCIENCES DEVELOPMENT

www.jssd.org.pk editor@jssd.org.pk

AN ANALYTICAL AND RESEARCH STUDY OF RAI FASIHULLAH JARRALL'S JOURNALISTIC AND EDITORIAL SERVICES

Usman Arif[1] & Dr. Syed Ashfaq Hussain Bukhari[2]

[1]Scholar, M Phil, Department of Urdu, Muslim Youth University (MY), Japan Road, Islamabad.

[2]Supervisor, Associate Professor, Department of Urdu, Muslim Youth University (MY), Japan Road, Islamabad.

KEYWORDS

Rai Fasihullah Jarrall, Journalistic Ethics, Editorial Management, Gulposh Wadiyan, Kashmiri Resistance Literature, Art for Life, Literary Criticism & Review, Regional History of Gujrat, Obscure Literary Figures

ARTICLE HISTORY

Date of Submission: 21-02-2026

Date of Acceptance: 23-03-2026

Date of Publication: 31-03-2026

ABSTRACT

This research paper presents an analytical study of Rai Fasihullah Jarrall's contributions to journalism, editorial work, and literary preservation, particularly focusing on the regional and national media landscape of Pakistan. Nurtured in an intellectually rich family environment under the guidance of his father, Khalid Pervez (Khalid Sherani), and mentored by prominent literary figures such as Professor Sharif Kunjahi during the sessions of "Atwari Kath" at the Al-Mir Library Trust, Rai Fasihullah developed a deeply rooted ethos of "Art for Life". His journalistic journey spans contributions to leading national dailies, including Nawa-i-Waqt, Daily Dunya, Mashriq, Express, and Aaj Kal, as well as working as a sub-editor for the weekly Kamraniyan. A key milestone in his career was the founding of the fortnightly literary journal Gulposh Wadiyan (2006–2012), which served as an intellectual platform promoting Kashmiri literature, resistance discourse, cultural identity, and constructive dialogue. Furthermore, Rai Fasihullah's work stands out for its rigorous research orientation, specifically in discovering and documenting obscure regional writers, local histories, and cultural heritage—providing vital primary sources for contemporary MPhil and PhD scholars. Rejecting sensationalism, his balanced editorial vision emphasizes social reform, objectivity, and ethical journalism.

CC BY NC 2026 Journal of Social Sciences Development

Corresponding Author	Dr. Syed Ashfaq Hussain Bukhari
Email:	ashfaq.hussain@myu.edu.pk

DOI	https://doi.org/10.59075/jssd.v5i1.381
Volume/Issue	5(1), 2026, 239-252

رائے فصیح اللہ جرال کی صحافت اور ادارت کا تجزیاتی مطالعہ ایک ایسا موضوع ہے جو نہ صرف گجرات کی ادبی تاریخ بلکہ پاکستان کے مجموعی صحافتی منظر نامے میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے صحافتی سفر کا آغاز کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک گہرا علمی پس منظر اور خاندانی روایت موجود تھی۔ ان کے والد، خالد پرویز، جو علمی حلقوں میں خالد شیرانی کے نام سے پہچانے جاتے تھے، خود صحافت اور ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رائے فصیح اللہ نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے گھر کا ماحول

کتابوں، رسالوں اور اخبارات کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ بچپن میں ہی علمی بحثوں کو سننے اور بڑے بڑے ادیبوں کی تحریروں نے ان کے اندر وہ شعور بیدار کر دیا جو آگے چل کر ان کی صحافتی شناخت کی بنیاد بنا۔ ان کی تربیت میں ان کے والد کا کلیدی کردار رہا ہے جنہوں نے نہ صرف انہیں لکھنے کی ترغیب دی بلکہ انہیں وہ فکری سمت بھی فراہم کی جس پر چل کر انہوں نے اپنی ایک الگ راہ متعین کی۔ اسی تناظر میں سر سید احمد خان کے نزدیک فکری تشکیل کے لیے خاندانی اور سماجی ماحول بنیادی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> "بڑے بڑے حکیم، بڑے بڑے کام کرنے والے، بڑے بڑے صاحبِ علم ہیں، ان کی خوبیاں تعلیم ہی سے لوگوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔"(۱)

ان کے ادبی اور صحافتی ارتقا میں المیر لائبریری ٹرسٹ کی علمی نشستوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ "اتواری کٹھ" کے نام سے منعقد ہونے والی یہ نشستیں گجرات کے علمی و ادبی افق پر ایک درخشندہ ستارے کی مانند تھیں۔ یہاں رائے فصیح اللہ کو پروفیسر شریف کنجاہی جیسی قد آور شخصیات کی قربت میسر آئی۔ ان نشستوں میں ہونے والی گفتگو، کتابوں پر تبصرے اور علمی مکالموں نے ان کی فکری پرداخت میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے اسی پلیٹ فارم سے اپنے لکھنے کے سفر کا باقاعدہ آغاز کیا اور ابتدا میں مختلف کتابوں پر تبصرے لکھنا شروع کیے۔ کسی بھی لکھاری کے لیے کتاب پر تبصرہ لکھنا ایک مشکل فن ہوتا ہے کیونکہ اس کے لیے کتاب کا گہرا مطالعہ اور معروضی تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔ رائے فصیح اللہ نے اس فن میں جلد ہی مہارت حاصل کر لی اور ان کے تبصرے علمی حلقوں میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے پسند کیے جانے لگے۔

رائے فصیح اللہ کا صحافتی سفر صرف تبصرہ نگاری تک محدود نہ رہا بلکہ انہوں نے عملی صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ انہوں نے پاکستان کے بڑے اور معتبر اخبارات جیسے "نوائے وقت"، روزنامہ "دنیا"، "مشرق"، "ایکسپریس" اور روزنامہ "آج کل" کے لیے کثرت سے مضامین اور کالم لکھے۔ ان کے کالموں کا بنیادی موضوع اکثر ادبی شخصیات، علاقائی تاریخ اور سماجی مسائل ہوتا تھا۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا توازن پایا جاتا ہے جہاں وہ صحافتی رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ ادبی جمالیات کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں۔ ان کی صحافت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ گمنام شعرا اور اہل قلم پر تحقیقی کالم لکھ کر انہیں منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ یہ وہ کام ہے جس کی بدولت آج کے دور میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبا ان کی تحریروں سے تحقیقی مواد اخذ کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی صحافت کے ذریعے ان لوگوں کو آواز دی جنہیں وقت کی گرد نے دھندلا دیا تھا۔

سن ۲۰۰۶ء میں انہوں نے ایک اہم سنگِ میل عبور کیا جب انہوں نے ۱۵ روزہ ادبی رسالہ 'گلپوش وادیاں' کا اجرا کیا۔ یہ رسالہ محض ایک جریدہ نہیں تھا بلکہ ایک تحریک تھی جس کا بنیادی مقصد تحریکِ کشمیر اور کشمیری ادبی لٹریچر کو عام قارئین تک پہنچانا تھا۔ رائے فصیح اللہ نے اس رسالے کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اگر ارادے پختہ ہوں تو محدود وسائل کے باوجود ایک معیاری علمی کام کیا جا سکتا ہے۔ 'گلپوش وادیاں' ۲۰۱۲ء تک مسلسل شائع ہوتا رہا اور اس دوران اس نے کئی اہم ادبی معرکے سر کیے۔ اس رسالے کی ادارت کے دوران ان کے

سامنے کئی چیلنجز آئے لیکن انہوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں اور علمی لگن سے ان کا مقابلہ کیا۔ انہوں نے اس جریدے میں نہ صرف بڑے ادیبوں کو جگہ دی بلکہ نئے لکھنے والوں کی بھی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ ان کا نظریہ ہمیشہ 'ادب برائے زندگی' رہا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ادب کو انسانی زندگی کے مسائل اور معاشرے کی مثبت تبدیلی کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ اس تصور کی توضیح محمد حسن عسکری کے اس قول سے بھی ہوتی ہے:

> "فن برائے فن ہر قسم کی آسانیوں، ترغیبوں اور مفادوں سے محفوظ رہ کر انسانی زندگی کی بنیادی حقیقتوں کو ڈھونڈنے کی خواہش کا نام ہے۔"(۳)

رائے فصیح اللہ کی صحافت میں مثبت طرزِ فکر کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ منفی پروپیگنڈے یا سنسنی خیزی کے سخت خلاف ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ایک صحافی اور مدیر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے میں موجود مثبت سوالات اور مسائل کو اجاگر کرے تاکہ ان کا کوئی تعمیری حل نکل سکے۔ ادارتی مزاج میں توازن اور ذمہ داری کی شرط کے بارے میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

> "تنقید عمومی اور سرسری اظہار رائے نہیں ہے۔ غیر قطعی اور گول مول بات کہنا نقاد کے منصب کے منافی ہے۔"(۴)

ان کی تحریروں میں جا بجا یہ فکر نظر آتی ہے کہ وہ معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں۔ انہوں نے ہفت روزہ "کامرانیاں" میں بطور سب ایڈیٹر کام کرتے ہوئے بھی انہی اصولوں کو مقدم رکھا۔ ان کی ادارت کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ ہر تحریر کو بڑی باریک بینی سے پرکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک مدیر کو نہ صرف زبان و بیان پر عبور ہونا چاہیے بلکہ اسے اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہونا چاہیے۔

ان کے صحافتی کام کا ایک بڑا حصہ علاقائی تاریخ اور ثقافت کے تحفظ پر مبنی ہے۔ انہوں نے گجرات اور گردونواح کے علاقوں کے بارے میں جو تحقیقی مقالے اور کالم لکھے ہیں، وہ تاریخ کے طالب علموں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے بارے میں مکمل اور مستند معلومات جمع کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادھوری معلومات کی بنیاد پر لکھنا قارئین کے ساتھ ناانصافی ہے۔ مقصدیت اور علمی دیانت کے باب میں مولوی عبدالحق کہتے ہیں:

> "بغیر کسی مقصد کے پڑھنا فضول ہے۔ اسی طرح بغیر کسی مقصد کے لکھنا بھی فضول ہے۔"(۵)

ان کی تحریروں پر علمی حلقوں میں بھرپور اعتماد کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر نئے لکھنے والوں کو بھی یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے علاقے کی مساجد، مدارس، پرانی عمارتوں اور مقامی اساتذہ پر لکھیں تاکہ آنے والی نسلیں اپنی تاریخ سے جڑی رہیں۔ رائے فصیح اللہ نے صحافت کو کبھی محض پیشہ نہیں سمجھا بلکہ اسے ایک مشن کے طور پر اپنایا۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ اتحاد اور بھائی چارے کا پیغام دیا۔ ان کی ادارتی پالیسی میں شدت پسندی یا فرقہ واریت کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اختلافی مضامین کو بھی بڑی مہارت سے سنبھالتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو

اور بات بھی پہنچ جائے۔ ان کا یہ اسلوب انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ ان کی صحافت کا سفر آج بھی جاری ہے اور وہ مختلف صورتوں میں علمی و ادبی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی شخصیت اور کام کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے صحافی اور مدیر ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی علم کی ترویج اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ ان کا کام نہ صرف موجودہ دور کے لیے مشعلِ راہ ہے بلکہ مستقبل کے محققین کے لیے بھی ایک گرانقدر علمی ورثہ ہے۔

رائے فصیح اللہ جرال کی صحافت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں ان کی تحریروں میں ایک گہرا سماجی شعور ملتا ہے۔ وہ صرف الفاظ کے جادوگر نہیں ہیں بلکہ ان کے الفاظ کے پیچھے ایک تڑپ اور ایک مقصد چھپا ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ صحافت کے ذریعے لوگوں کی ذہنی تربیت کی جائے اور انہیں اعلیٰ انسانی اقدار کی طرف راغب کیا جائے۔ ان کی صحافت میں گجرات کی مٹی کی خوشبو بھی ہے اور عالمی ادب کی وسعت بھی۔ ان کا سفر المیر لائبریری کی خاموش نشستوں سے شروع ہو کر قومی سطح کے اخبارات تک پھیلا ہوا ہے، جو ان کی انتھک محنت اور علمی جستجو کا بین ثبوت ہے۔ ان کے کام کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے صحافت اور ادارت کے شعبے میں جو نقوش چھوڑے ہیں، وہ طویل عرصے تک یاد رکھے جائیں گے اور آنے والے وقت میں ان کی اہمیت مزید اجاگر ہوگی۔

1. خاندانی پس منظر اور آغاز:

رائے فصیح اللہ جرال کی شخصیت اور ان کے فن کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ان کی علمی و ادبی آبیاری میں ان کے خاندانی پس منظر اور صحافتی وراثت نے ایک بنیادی ستون کا کردار ادا کیا ہے۔ کسی بھی انسان کی فکری ساخت میں اس کے گھر کے ماحول اور والدین کی تربیت کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور رائے فصیح اللہ کے معاملے میں یہ اثرات بہت واضح اور گہرے ہیں۔ ان کے والدِ محترم خالد پرویز، جو ادبی و صحافتی حلقوں میں خالد شیرانی کے نام سے ایک معتبر پہچان رکھتے تھے، خود علم و دانش کا ایک روشن مینار تھے۔ خالد شیرانی صاحب کا صحافت سے وابستہ ہونا محض ایک پیشہ ورانہ ضرورت نہیں تھی، بلکہ یہ ان کے علمی شغف اور سماجی شعور کا اظہار تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی حرف و حکایت کی نذر کر دی تھی اور یہی وہ علمی تڑپ تھی جو وراثت میں رائے فصیح اللہ کو منتقل ہوئی۔

رائے فصیح اللہ نے جب ہوش سنبھالا تو ان کے گھر کی فضا عام گھروں سے یکسر مختلف تھی۔ ان کے گھر میں کھلونوں سے زیادہ کتابوں کی بہتات تھی اور دیواریں الماریوں سے سجی ہوئی تھیں جن میں ادب، تاریخ، سیاست اور مذہب پر مشتمل کتب کا ذخیرہ موجود تھا۔ بچپن کے وہ ایام جب بچے کھیل کود میں مگن ہوتے ہیں، رائے فصیح اللہ اس وقت اپنے والد کے پاس بیٹھ کر اخبارات کی سرخیاں پڑھنا سیکھ رہے تھے۔ ان کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی جہاں صبح کا آغاز اخبار کی آمد سے ہوتا تھا اور رات کی گفتگو کا محور کوئی نئی چھپنے والی کتاب یا ملک کے سیاسی و ادبی

حالات ہوتے تھے۔خالد شیرانی صاحب نے اپنے بیٹے کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی تھی کہ قلم کی حرمت اور لفظ کی طاقت سے ہی معاشرے میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔

خالد شیرانی صاحب کی صحافتی خدمات گجرات اور گردونواح کے علاقوں میں ایک خاص مقام رکھتی تھیں۔وہ ایک ایسے صحافی تھے جو حق گوئی اور بے باکی پر یقین رکھتے تھے اور ان کی یہی خصوصیت رائے فصیح اللہ کے مزاج کا حصہ بنی۔گھر میں موجود رسائل جیسے "نقوش"،"فنون"،"اوراق" اور روزنامہ اخبارات کی موجودگی نے رائے فصیح اللہ کے اندر مطالعہ کا وہ شوق پیدا کیا جو آگے چل کر ان کے صحافتی کیریئر کی بنیاد بنا۔انہوں نے بچپن میں ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ ایک صحافی کس طرح معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے اور کس طرح اس کے الفاظ لوگوں کے خیالات کو متاثر کرتے ہیں۔ان کے والد کے پاس آنے والے ادیبوں اور دانشوروں کی محفلوں نے انہیں وہ فکری بالیدگی عطا کی جو برسوں کی ریاضت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

رائے فصیح اللہ کی صحافتی وراثت صرف معلومات تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ اقدار کی وہ منتقلی تھی جس نے انہیں ایک ذمہ دار قلم کار بنایا۔ان کے والد نے انہیں سکھایا کہ صحافت محض خبر رسانی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک امانت ہے جسے دیانت داری سے نبھانا چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ جب رائے فصیح اللہ نے باقاعدہ طور پر صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ان کے پاس نہ صرف ایک وسیع علمی ذخیرہ تھا بلکہ وہ تمام اخلاقی اصول بھی موجود تھے جو ایک مثالی صحافی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ان کی پرورش کے دوران کتابوں سے لگاؤ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ گھنٹوں اپنے والد کی لائبریری میں گزار دیتے تھے،جہاں وہ کلاسیکی ادب سے لے کر جدید صحافتی اسلوب تک سب کچھ پڑھ ڈالتے تھے۔

خالد شیرانی صاحب نے اپنے بیٹے کی علمی تربیت اس نہج پر کی کہ ان کے اندر تحقیق کا مادہ پیدا ہو گیا۔وہ صرف پڑھتے نہیں تھے بلکہ ان کے والد انہیں مختلف موضوعات پر بحث کرنے اور اپنی رائے دینے کی ترغیب دیتے تھے۔اس حوصلہ افزائی نے رائے فصیح اللہ کے اندر خود اعتمادی پیدا کی اور انہیں یہ احساس دلایا کہ ان کے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ اہم ہے۔ان کی صحافتی وراثت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے خاندان میں علم کی ترویج کو ایک مقدس فرض سمجھا جاتا تھا۔ان کے گھر کا وہ علمی ماحول،جہاں ہر سو بکھری کتابیں اور اخبارات کی خوشبو رچی بسی تھی،ان کے لیے ایک ایسی یونیورسٹی ثابت ہوا جس نے ان کے تخیل کو پرواز دی اور انہیں ایک ایسی پہچان عطا کی جو آج کے دور میں بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔اس خاندانی پس منظر نے رائے فصیح اللہ جرال کو ایک ایسا مستند صحافی اور مدیر بنا دیا جس کی تحریروں میں وہی خاندانی وقار اور علمی گہرائی نظر آتی ہے جو ان کے بزرگوں کا خاصہ تھی۔

ان نشستوں کی سب سے بڑی برکت پروفیسر شریف کنجاہی جیسی عبقری شخصیت کی رہنمائی تھی۔پروفیسر شریف کنجاہی،جو اپنی لسانی گرفت،گہرے مشاہدے اور جدید فکر کی بدولت اردو اور پنجابی ادب کا معتبر نام تھے،ان کی صحبت نے رائے فصیح اللہ کے اندر چھپے ہوئے تخلیقی جوہر کو جلا بخشی۔پروفیسر صاحب کی موجودگی نے انہیں یہ سکھایا کہ ادب صرف الفاظ کی ترتیب کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی کے حقائق کو پرکھنے اور انہیں شعور کی زبان دینے کا عمل ہے۔شریف

کنجاہی کے علاوہ دیگر اکابرینِ ادب کی صحبت نے ان کے اندر لکھنے کا وہ شوق اور تڑپ پیدا کی جو ایک پختہ کار ادیب کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ ان بزرگوں کے درمیان بیٹھ کر انہوں نے سیکھا کہ کس طرح ایک جملہ تراشا جاتا ہے اور کس طرح کسی خیال کو مدلل انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

رائے فصیح اللہ کی صحافتی پہچان کی پہلی اینٹ 'کتابوں پر تبصرہ نگاری' سے رکھی گئی۔ ابتدا میں انہوں نے مختلف علمی و ادبی کتب کا مطالعہ کیا اور ان پر اپنی معروضی آرا تحریر کرنا شروع کیں۔ کسی بھی نئے لکھنے والے کے لیے کتاب پر تبصرہ لکھنا ایک کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے لیے کتاب کی روح تک پہنچنا اور مصنف کے نقطہ نظر کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رائے فصیح اللہ نے اس فن کو بہت جلد اپنا لیا اور ان کے تبصرے اپنی علمی گہرائی اور شستہ بیانی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں توجہ حاصل کرنے لگے۔ ان کے یہ تبصرے مختلف جرائد اور اخبارات کی زینت بنے، جس سے نہ صرف ان کا حلقہ تعارف وسیع ہوا بلکہ انہیں صحافتی دنیا میں ایک سنجیدہ قلم کار کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ یہ تبصرہ نگاری ہی تھی جس نے ان کے مشاہدے کو تیز کیا اور انہیں مستقبل کی بڑی صحافتی ذمہ داریوں کے لیے تیار کیا۔ شمس الرحمن فاروقی کے نزدیک تنقید/تبصرہ محض معلومات بڑھانے کا نام نہیں، وہ لکھتے ہیں:

> "تنقید کا مقصد معلومات میں اضافہ کرنا نہیں بلکہ علم میں اضافہ کرنا ہے۔"(۲)

المیر لائبریری ٹرسٹ سے شروع ہونے والا یہ سفر، جو 'اتواری کٹھ' کی علمی بحثوں اور اکابرین کی شفقت سے پروان چڑھا، آگے چل کر ان کی صحافتی شناخت کا سب سے مضبوط حوالہ بن گیا۔

رسالہ "گلپوش وادیاں" کی صحافتی اہمیت:

رائے فصیح اللہ جرال کی صحافتی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی پیشہ ورانہ شناخت محض چند تحریروں تک محدود نہیں ہے بلکہ انہوں نے پاکستان کے انتہائی معتبر اور بڑے صحافتی اداروں کے ساتھ وابستہ رہ کر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ ان کی صحافتی وابستگیاں متنوع ہیں، جو ایک طرف روزنامہ اخبارات کی تیز رفتار دنیا سے جڑی ہیں تو دوسری طرف ہفت روزہ رسائل کی فکری گہرائی تک پھیلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے "نوائے وقت"، "روزنامہ دنیا"، "مشرق"، "ایکسپریس" اور "روزنامہ آج کل" جیسے بڑے اخبارات میں کثرت سے مضامین اور کالم لکھے۔ ان اداروں کے ساتھ ان کا تعلق محض ایک لکھاری کا نہیں تھا بلکہ وہ ان اخبارات کے ادارتی صفحات کی زینت بننے والے ایسے مضامین تخلیق کرتے تھے جن میں خبر کی صداقت اور ادب کی چاشنی ایک ساتھ موجود ہوتی تھی۔ ان بڑے اخبارات کے ساتھ کام کرنے سے ان کے مشاہدے میں وسعت پیدا ہوئی اور انہیں قومی و بین الاقوامی سطح کے مسائل کو ادبی تناظر میں دیکھنے کا موقع ملا۔ "نوائے وقت" جیسے نظریاتی

اخبار سے لے کر "ایکسپریس" اور "دنیا" جیسے جدید صحافتی اسلوب رکھنے والے اداروں تک، رائے فصیح اللہ نے ہر جگہ اپنے منفرد قلمی رنگ کو برقرار رکھا۔

ان کے صحافتی کیریئر میں ہفت روزہ "کامرانیاں" کے ساتھ بطور سب ایڈیٹر وابستگی ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک سب ایڈیٹر کا کام کسی بھی جریدے یا اخبار میں ریڑھ کی ہڈی جیسا ہوتا ہے، جہاں اسے خام مواد کو تراش کر خوبصورت اور پڑھنے کے قابل تحریر میں بدلنا ہوتا ہے۔ رائے فصیح اللہ نے اس ذمہ داری کو بڑی عمدگی سے نبھایا۔ "کامرانیاں" میں کام کے دوران انہوں نے خبروں کی نوک پلک سنوارنے، سرخیوں کے انتخاب اور صفحات کی ترتیب و تزئین کے فن میں مہارت حاصل کی۔ یہیں سے ان کے اندر وہ ادارتی شعور پختہ ہوا جس نے آگے چل کر انہیں اپنے ذاتی رسالے "گلپوش وادیاں" کی کامیابی میں مدد دی۔ سب ایڈیٹنگ کے اس تجربے نے انہیں زبان و بیان کی باریکیوں سے روشناس کرایا اور انہیں یہ سکھایا کہ کس طرح ایک خشک خبر کو بھی دلچسپ پیرائے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ تجربہ ان کی بعد کی زندگی میں بہت کام آیا، کیونکہ ایک مدیر کے لیے سب ایڈیٹنگ کے مراحل سے گزرنا اسے فنی طور پر زیادہ مضبوط بنا دیتا ہے۔

رائے فصیح اللہ کی تحریروں کا بڑا وصف ان کا دوہرا اسلوب ہے، جہاں "ادبی تحقیق" اور "صحافتی رپورٹنگ" کے رنگ باہم پیوست نظر آتے ہیں۔ عام طور پر صحافی صرف سطحی خبروں تک محدود رہتے ہیں اور محقق صرف لائبریریوں کی حد تک، لیکن رائے فصیح اللہ نے ان دونوں میدانوں کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کیا ہے۔ جب وہ کسی ادبی شخصیت پر کالم لکھتے ہیں تو ان کا انداز ایک محقق کا ہوتا ہے جو پرانے ریکارڈز، لائبریریوں اور نایاب کتابوں سے حوالے تلاش کر کے لاتا ہے۔ ان کی تحریروں میں ماخذ کی تلاش اور حقائق کی چھان پھٹک ایک تحقیقی مقالے کی یاد دلاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے کالموں کو علمی حلقوں میں سند مانا جاتا ہے۔ ایم فل و پی ایچ ڈی کے طلبا اپنے تحقیقی مقالہ جات کے لیے ان کی تحریروں سے استفادہ کرتے ہیں۔ وہ گمنام ادیبوں اور شعراء کو تاریخ کے گرد آلود صفحات سے نکال کر دورِ حاضر کے قارئین کے سامنے پیش کرنے کا فن جانتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی فکری ذمہ داری اور روایت سے ربط کے ضمن میں انتظار حسین کہتے ہیں:

> "زمانے کی قسم آج کا لکھنے والا خسارے میں ہے اور بے شک ادب کی نجات اسی خسارے میں ہے۔ یہ خسارہ ہماری ادبی روایت کی مقدس امانت ہے۔"(۷)

ان کی تحریروں میں صحافتی رپورٹنگ کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ وہ جب کسی ادبی تقریب، مشاعرے یا سماجی مسئلے پر لکھتے ہیں تو ان کا انداز ایک متحرک رپورٹر کا ہوتا ہے جو منظر کشی کے ذریعے قاری کو اسی مقام پر لے جاتا ہے۔ ان کی رپورٹنگ میں صداقت، غیر جانبداری اور مشاہدے کی گہرائی ہوتی ہے۔ وہ صرف واقعہ بیان نہیں کرتے بلکہ اس کے پس پردہ محرکات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مضامین میں یہ 'ڈبل شیڈ' یا دوہرا رنگ ان کی تحریر کو ایک عام کالم سے بلند کر کے ایک پائیدار ادبی دستاویز بنا دیتا ہے۔ ان کی تحقیق میں صحافت کی روانی اور وقار ہے۔ یہ توازن برقرار رکھنا ہر لکھاری کے بس کی بات نہیں ہوتی لیکن رائے فصیح اللہ نے اسے اپنی مستقل پہچان بنا لیا ہے۔

بڑے اخبارات میں ان کے مضامین کی کثرت اس بات کی غماز ہے کہ وہ ایک انتہائی زرخیز ذہن کے مالک ہیں۔ انہوں نے علاقائی تاریخ، کشمیری ادب، مقامی شخصیات اور علمی موضوعات پر جس تواتر سے لکھا، اس نے انہیں ایک مستند حوالہ بنا دیا ہے۔ ان کی صحافتی وابستگیوں نے انہیں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں سے ملنے اور ان کے خیالات کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا، جس کا عکس ان کی متوازن سوچ میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے صحافت کو صرف معلومات کی فراہمی کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے ادب کی ترویج اور نئی نسل کی علمی آبیاری کے لیے استعمال کیا۔ 'نوائے وقت'، 'دنیا'، 'مشرق' اور 'ایکسپریس' جیسے پلیٹ فارمز نے انہیں وہ وسعت دی جس کے ذریعے وہ اپنے پیغام کو لاکھوں قارئین تک پہنچانے میں کامیاب رہے۔ مجموعی طور پر ان کا صحافتی سفر ایک ایسی داستان ہے جس میں محنت، تحقیق اور ادب کی لگن شامل ہے اور ان کی یہ وابستگیاں ان کی علمی عظمت کی گواہ ہیں۔

رائے فصیح اللہ جرال کے جاری کردہ 15 روزہ ادبی رسالے "گلپوش وادیاں" کو اگر محض ایک اشاعتی منصوبہ سمجھا جائے تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوگی کیونکہ یہ جریدہ ایک فکری تحریک، ایک تہذیبی بیانیے اور مزاحمتی لٹریچر کی ترجمانی کرتا تھا جس کی بنیاد خالصتاً 'ادب برائے زندگی' کا نظریہ تھا۔ 2006ء میں جب یہ رسالہ جاری ہوا تو جنوبی ایشیا خصوصاً پاکستان میں ادبی جرائد ایسے عبوری زمانے سے گزر رہے تھے جہاں پرنٹ میڈیا پر ابھی انٹرنیٹ کا غلبہ پوری طرح نہیں ہوا تھا، ادیبوں سے خط و کتابت کے ذریعے رابطے ہوتے تھے اور علمی مباحث صرف رسائل کے صفحات پر ہی جلوہ گر ہوتے تھے۔ ایسے ماحول میں "گلپوش وادیاں" کا اجرا شعوری ادبی پالیسی کے تحت ہوا جس میں سب سے پہلے یہ طے کیا گیا کہ ادب کا مقصد محض تفریح یا تجارت نہیں، بلکہ معاشرتی شعور، قومی شناخت اور زندہ تحریکوں کی فکری آبیاری ہے۔ رائے فصیح اللہ کے اپنے بیان کے مطابق، جریدے کے لیے پہلی ترجیح پیسے کا حصول نہیں بلکہ تحریکِ کشمیر اور کشمیری لٹریچر کا فروغ تھا۔

گلپوش وادیاں کا مقصد اور فکری بنیاد:

رسالے کا نام "گلپوش وادیاں" اپنے اندر ایک استعارہ رکھتا ہے؛ ایسی وادیاں جو حسن سے آراستہ بھی ہیں، زخم خوردہ بھی اور جن کی شناخت عالمی سطح پر ایک متنازع سیاسی حقیقت کے طور پر بھی کی جاتی ہے۔ جریدے کا بنیادی مقصد تحریکِ کشمیر کے ساتھ فکری وابستگی کو ادبی بیانیے میں منتقل کرنا، کشمیری مزاحمتی شعور کو نرم مگر مؤثر ادبی پیرایے میں محفوظ کرنا اور کشمیری ادب کو پاکستان کے ادبی حلقوں میں متعارف کروانا تھا۔ یہ وہ مقصد تھا جو صرف سیاسی نعرے بازی سے پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے مدیر نے اسے ایک ادبی و تحقیقی تحریک کی صورت میں آگے بڑھایا، جس میں معروف کشمیری ادیبوں مثلاً شریف کنجاہی اور ظہور کنجاہی جیسے ناموں کے انٹرویوز شائع کیے گئے تاکہ ایک طرف کشمیر کی علمی روایت کی نمائندگی ہو اور دوسری طرف تحریک کی انسانی، فکری اور تہذیبی جہت قارئین تک پہنچے۔

ادبی لٹریچر کا فروغ:

"گلپوش وادیاں" نے کشمیری ادبی لٹریچر کو صرف شائع نہیں کیا بلکہ اسے ایک مرکزی قومی ادبی مکالمے کا حصّہ بھی بنایا۔ کشمیری ادب چونکہ مزاحمتی شناخت، صوفیانہ جمالیات اور تہذیبی دکھ کا حسین امتزاج رکھتا ہے، اس لیے اس رسالے کے ذریعے وہ تحریریں قارئین تک پہنچیں جن میں کشمیر کا دکھ خطیبانہ شور کی بجائے ادبی وقار کے ساتھ بیان ہوا۔ اس جریدے کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ اس نے مرکز سے دور دیہی اور علاقائی اہلِ قلم کو بھی ساتھ شامل کیا۔ پنجاب کے مختلف شہروں، گجرات، گوجرانوالہ، لالہ موسیٰ اور دیگر ادبی حلقوں سے وابستہ لکھاریوں کو بھی رسالے میں جگہ دی گئی تاکہ ادب ایک اجتماعی سماجی شعور کے ساتھ پروان چڑھے۔ اس شمولیتی پالیسی نے رسالے کو علاقائی ہونے کے باوجود فکری طور پر قومی اور تہذیبی جریدہ بنا دیا، کیونکہ کشمیر کے بیانیے کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ اسے صرف کشمیری قلم کاروں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اسے پاکستان کے ادبی ذہن میں بھی پیوست کیا جائے۔

ادارتی اصول اور مواد کا انتخاب:

مدیر نے رسالے کی ادارت کے لیے جن اصولوں کو بنیاد بنایا، وہ اس جریدے کے اثرات سمجھنے میں نہایت اہم ہیں۔ ان کے مطابق:

"1۔ ادب برائے زندگی اولین اصول ہے۔
2۔ تنقید اصلاحی اور تعمیری ہونی چاہیے، نہ کہ ذاتیات پر مبنی۔
3۔ سیاسی، سماجی اور مذہبی مباحث میں مثبت اور نرم بیانیہ اختیار کیا جائے تاکہ جریدہ نفرت یا شدت پسندی کا نہیں بلکہ شعور اور مکالمے کا ترجمان بنے۔
4۔ تحقیق پر مبنی مضامین میں مستند ماخذات اور A–Z معلومات ضروری ہیں وغیرہ"۔(2)

یہ اصول اس دور میں نہایت اہم تھے کیونکہ تحریکِ کشمیر ایک جذباتی مگر نازک موضوع تھا، جہاں ذرا سی شدت یا غیر ذمہ دار بیانیہ معاشرتی تقسیم کو ہوا دے سکتا تھا۔ اسی لیے مدیر نے ایسے مضامین اور خطوط میں بھی سنسر شپ یا ادبی نرمی اختیار کی جہاں اختلافات شدت اختیار کر سکتے تھے، جیسا کہ ڈاکٹر انور سدید کے خط کے بعض حصوں کو حذف یا نرم کیا گیا تاکہ ادارے کی پالیسی، ادبی وقار اور سماجی امن برقرار رہے۔ 2006ء سے 2012ء تک کا دور پاکستان میں ادبی صحافت کے لیے ایک انتقالی مرحلہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ادبی جرائد عوامی اور فکری مباحث کا مرکزی ذریعہ تھے اور کشمیر پر لکھنے کا رجحان موجود تو تھا مگر باقاعدہ ادبی تحقیقی جریدے بہت کم تھے۔ انٹرنیٹ کی رسائی بڑھ رہی تھی مگر علمی ورثہ ابھی پرنٹ کے صفحات پر محفوظ ہو رہا تھا۔ ایسے میں "گلپوش

وادیاں" نے کشمیر کی تحریک کو نعرے سے مکالمے، جذبات سے تحقیق اوراحتجاج سے ادب کی طرف منتقل کرنے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس رسالے نے کشمیر کے مسئلے کو ایک انسانی، تہذیبی اور ادبی تناظر میں پیش کیا، جس کے نتیجے میں یہ تحریک صرف سیاسی نہیں بلکہ ایک تہذیبی شناختی بیانیہ بھی بن گئی۔

گلپوش وادیاں کے علمی اثرات:

گلپوش وادیاں میں شائع شدہ تحریریں آج کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلبہ کے لیے انتہائی کارآمد تحقیقی مواد ثابت ہو رہی ہیں، کیونکہ ان میں ایسی معلومات اور ادبی مباحث محفوظ ہیں جو اب عام لائبریریوں میں بھی نایاب ہو چکے ہیں۔ طلبہ رسالے کی فائلیں دیکھ کر ایسے ادبی اور تاریخی حوالے حاصل کرتے ہیں جو ان کی تحقیق میں بنیادی ماخذ کے طور پر مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ اثر اس بات کا ثبوت ہے کہ "گلپوش وادیاں" نے علمی ورثے کی نئی نسل تک منتقلی میں بھی ایک مستقل کردار ادا کیا۔

رسالہ ”گلپوش وادیاں“ محض ایک ادبی جریدہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسا فکری و تہذیبی منصوبہ تھا جس نے تحریکِ کشمیر کو پاکستان کے ادبی اور سیاسی مکالمے کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔ ایسے عہد میں جب کشمیر کا مسئلہ زیادہ تر سیاسی نعروں، سرکاری بیانات اور وقتی احتجاجی زبان تک محدود ہو چکا تھا، ”گلپوش وادیاں“ نے اسے ادب، فکر اور انسانی شعور کی سطح پر منتقل کرنے کی سنجیدہ کوششیں کیں۔ یہی وہ بنیادی وصف ہے جو اس رسالے کو محض ایک اشاعتی سرگرمی کی بجائے ایک ادبی سیاسی تحریک کی حیثیت عطا کرتا ہے۔

> ”اے اہلِ وطن آؤ آج اک عہد کریں کہ میرے وجود کے ٹکڑے نہیں ہونے دو گے۔ میرے ساتھ ہونے والے ظلم ،ناانصافیوں اور حقوق کی پامالیوں کے خلاف میرے وجود کو ختم کرنے والی ہر سازش کو کچلنے کے لیے آپس میں اتفاق و اتحاد ،پیار و محبت کو فروغ دے کر یہ کینہ ،تفرقہ بازی ،لڑائی جھگڑے منافقانہ عادتیں ختم کردیں۔“(۸)

”گلپوش وادیاں“ کی نمایاں سیاسی خدمت یہ رہی کہ اس نے تحریکِ کشمیر کو پاکستان کے ادبی سیاسی مکالمے میں شامل کیا۔ رسالے کے ذریعے کشمیر افسانے، نظم، غزل، تنقیدی مضامین اور تحقیقی تحریروں کا مستقل موضوع بننے لگا۔ اس عمل نے کشمیر کو صرف ایک علاقائی یا سفارتی مسئلہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے قومی فکری شعور کا حصہ بنا دیا۔ ادب کے ذریعے جب کشمیر کا ذکر ہوا تو وہ محض خبر یا نعرہ نہیں رہا بلکہ ایک زندہ انسانی تجربہ بن کر سامنے آیا، جس سے قاری ذہنی اور اخلاقی سطح پر جڑ گیا۔

اس رسالے کا ایک اہم سیاسی اثر یہ بھی تھا کہ اس نے کشمیری تحریک کو انسانی اور فکری شناخت دی، نہ کہ اسے محض نعروں تک محدود رکھا۔ ”گلپوش وادیاں“ میں شامل تحریروں نے کشمیری عوام کو صرف مظلوم ہجوم کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ ایک ایسے معاشرے کے طور پر دکھایا جو سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے، لکھتا ہے

اور اپنی تہذیبی شناخت کا شعور رکھتا ہے۔ افسانوی کردار ہوں یا شعری آوازیں، سب نے مل کر کشمیری دکھ کو انسانی سطح پر منتقل کیا۔ اس طرح تحریک ایک سیاسی مطالبے سے آگے بڑھ کر انسانی ضمیر کا سوال بن گئی۔

سیاسی طور پر "گلپوش وادیاں" کی ایک بڑی کامیابی یہ تھی کہ اس نے کشمیری قیادت، ادیبوں اور عوامی شعور کو ایک نرم مزاحمتی ادبی فریم ورک میں پیش کیا۔ اس فریم ورک میں شدت، اشتعال یا جارحانہ زبان کے بجائے وقار، تہذیب اور اخلاقی استدلال کو مقدم رکھا۔ رسالے کی پالیسی یہی دکھائی دیتی ہے کہ مزاحمت کو ادب کی جمالیات میں ڈھال کر پیش کیا جائے تاکہ تحریک کا تاثر مثبت، سنجیدہ اور دیرپا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ "گلپوش وادیاں" میں شامل تحریریں احتجاجی ہونے کے باوجود خطیبانہ شور سے بڑی حد تک پاک نظر آتی ہیں۔

> "ہمارے اندر سے مسلمانی نکال دی گئی ہے جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان سولہ دسمبر ۱۹۷۱ کو بنگلہ دیش بن گیا۔ آج دشمن بچے کھچے پاکستان کے بھی حصے ٹکڑے کرنے کے درپے ہے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ آخر اس گھمبیر مسئلے کا حل کیا ہے؟ ہم دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خود کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا لیں تاکہ دشمن اس میں دراڑ پیدا نہ کر سکے۔" (۹)

یہ نرم مزاحمتی فریم ورک دراصل ایک شعوری سیاسی حکمتِ عملی تھی۔ "گلپوش وادیاں" نے قیادت کو محض سیاسی رہنما کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری و تہذیبی نمائندہ بنا کر پیش کیا، جبکہ عوام کو محض احتجاجی قوت نہیں بلکہ ایک باشعور اور زندہ معاشرہ دکھایا۔ اس اندازِ پیشکش نے تحریکِ کشمیر کو عالمی سطح پر بھی زیادہ قابلِ فہم بنانے کی صلاحیت پیدا کی، کیونکہ ادب کی زبان براہِ راست سیاسی زبان سے زیادہ وسیع اور مؤثر ہوتی ہے۔

پاکستان کے ادبی منظرنامے میں "گلپوش وادیاں" کی اشاعت نے یہ احساس بھی مضبوط کیا کہ کشمیر کا مسئلہ محض جغرافیائی یا سرحدی تنازع نہیں بلکہ انسانی حقوق، شناخت اور تہذیبی بقا کا مسئلہ ہے۔ ادب چونکہ اجتماعی یادداشت تشکیل دیتا ہے، اس لیے رسالے نے تحریکِ کشمیر کو وقتی سیاسی حالات سے نکال کر ایک مستقل فکری روایت میں ڈھال دیا۔ یہی وہ پہلو ہے جو کسی بھی تحریک کو وقتی ابال کے بجائے تاریخی تسلسل عطا کرتا ہے۔

نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسالہ "گلپوش وادیاں" نے تحریکِ کشمیر کے سیاسی بیانیے کو نہ صرف وسعت دی بلکہ اسے تہذیبی وقار، فکری گہرائی اور انسانی معنویت بھی عطا کی۔ اس رسالے کے ذریعے کشمیر پاکستان میں صرف ایک سیاسی مطالبہ نہیں رہا بلکہ ایک ادبی، فکری اور اخلاقی ڈسکورس بن گیا۔ یہی "گلپوش وادیاں" کا سب سے بڑا اور دیرپا سیاسی اثر ہے، جو اسے اردو ادب اور تحریکِ کشمیر دونوں کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

رسالہ "گلپوش وادیاں" نے کشمیری ادب کو قومی ادبی دھارے میں متعارف کروایا۔ اس مقصد کے لیے معروف ادیبوں کے انٹرویوز اور تحقیقی مضامین سے ادبی اتھارٹی اور مستند روایت قائم کی۔ مقامی و دیہی اہل قلم کو شامل کر کے ادب کی جمہوری توسیع کی۔ اس رسالے نے اپنی تحریروں کے ذریعے شدت پسندی کے بجائے مثبت اور تعمیری آرا کو فروغ دیا اور بین المسالک اور فکری اختلافات میں ادبی اعتدال اور سماجی امن کی حکمت عملی وضع کرنے میں مدد دی۔ اس کے ساتھ ساتھ نوجوان لکھاریوں اور محققین کے لیے حوصلہ افزائی اور تحقیقی رہنمائی کا ذریعہ بنا۔

> ”ادب کو زندگی کا آئینہ دار کہا جاتا ہے۔زندگی اور اس کے متعلقہ مسائل و مصائب کو اجاگر کر کے ان کا دیرپا حل نکالنا نیز افراد کو بہتر زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانا ادب کے فرائض میں شامل ہے یوں کہ لیجیے کہ ادب کا اصل مقصد معاشرے میں صحت مند رجحانات کو فروغ دے کر مادیت پرستی اور انانیت کش اقدامات کا قلع قمع کرنا ہے۔“(۱۰)

"گلپوش وادیاں" 2006ء میں محض ایک رسالہ نہیں تھا بلکہ ایک ادبی فکری پلیٹ فارم تھا جس نے کشمیر کی تحریک کو تحقیقی، ادبی اور مثبت بیانیے کے ساتھ نہ صرف محفوظ کی بلکہ اسے اگلی نسل تک منتقل بھی کیا۔ 2012ء میں اس کی اشاعت اگرچہ رک گئی، لیکن اس کے صفحات پر محفوظ لٹریچر آج بھی زندہ ہے، محققین کے کام آرہا ہے اور نئی نسل کے فکری سرمائے میں اضافہ کر رہا ہے۔ اس جریدے نے کشمیر کے بیانیے کو مزاحمتی ادب، قومی مکالمے اور تحقیقی روایت میں ڈھال کر جو خدمت انجام دی، وہ اسے پاکستان کی ادبی صحافت کی تاریخ میں ایک یادگار اور اثر آفریں باب بنا دیتی ہے۔

اخبارات کے ساتھ وابستگی:

رائے فصیح اللہ جرال کی صحافتی زندگی کا ایک روشن پہلو ان کی وہ طویل اور مستند وابستگیاں ہیں جو انہوں نے پاکستان کے معتبر اور کثیر الاشاعت اخبارات کے ساتھ قائم کیں۔ ان کی قلمی خدمات محض مقامی سطح تک محدود نہ رہیں بلکہ انہوں نے اپنی فکری جولانیوں سے قومی صحافت کے افق پر بھی گہرے نقوش ثبت کیے۔ انہوں نے "نوائے وقت"، روزنامہ "دنیا"، "مشرق"، "ایکسپریس'' اور روزنامہ" آج کل'' جیسے بڑے اداروں کے لیے کثرت سے کالم اور مضامین تحریر کیے۔ ان اخبارات کے ساتھ ان کی وابستگی اس بات کی غماز ہے کہ ان کا اسلوب اور مواد اس قدر جاندار اور مستند تھا کہ اسے ملک کے صفِ اول کے ادارتی صفحات پر جگہ دی گئی۔ ان اخبارات میں لکھنا کسی بھی صحافی کے لیے ایک بڑا اعزاز ہوتا ہے اور رائے فصیح اللہ نے ان پلیٹ فارمز کے ذریعے اپنی آواز لاکھوں قارئین تک پہنچائی۔ ان کے مضامین نے نہ صرف علمی حلقوں میں پذیرائی حاصل کی بلکہ عام قارئین کے شعور کی بالیدگی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

تحقیقی کام اور گمنام ادیبوں کی دریافت:

رائے فصیح اللہ جبرال کی صحافت کا ایک ایسا منفرد اور گرانقدر پہلو، جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے، ان کا تحقیقی مادہ اور گمنام ادبی شخصیات کی دریافت ہے۔ عام طور پر صحافتی کالم نگاری وقتی مسائل یا معروف شخصیات کے گرد گھومتی ہے، لیکن رائے فصیح اللہ نے اس کے برعکس ایک کٹھن مگر نہایت اہم راستہ چنا۔ انہوں نے اپنی قلمی توانائیوں کا ایک بڑا حصہ ان شعراء، ادیبوں اور اہل قلم کی زندگیوں اور کام کو اجاگر کرنے کے لیے وقف کر دیا جو وقت کی گرد میں اوجھل ہو چکے تھے یا جنہیں ادبی مراکز سے دوری کی وجہ سے وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ حقدار تھے۔ ان کی صحافت محض خبر رسانی نہیں بلکہ "ادبی آثار قدیمہ" کی ایک مہم ہے، جس کے ذریعے وہ گمنام گوشوں سے ایسے ہیرے تراش کر لائے جنہوں نے اردو اور علاقائی ادب کی آبیاری کی تھی۔

ان کی تحقیق کا دائرہ کار صرف بڑے شہروں تک محدود نہیں رہا، بلکہ انہوں نے دیہاتوں اور دور دراز علاقوں کے گمنام اہل قلم پر تحقیقی کالم لکھ کر انہیں منظرِ عام پر لانے کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے نزدیک ہر وہ شخص جو ادب کی خدمت کر رہا ہے، چاہے وہ کسی چھوٹے سے قصبے کی مسجد کا معلم ہو یا کسی پرائمری اسکول کا استاد، وہ اس لائق ہے کہ اس کی علمی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ انہوں نے اپنے کالموں میں ان گمنام ہستیوں کے سوانحی خاکے، ان کے فن کا تجزیہ اور ان کی علمی باقیات کو اس طرح پیش کیا کہ ادبی دنیا ان سے متعارف ہونے پر مجبور ہو گئی۔ یہ ایک ایسا تحقیقی کام ہے جس کے لیے برسوں کی ریاضت، نایاب دستاویزات کی تلاش اور ذاتی ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ درکار ہوتا ہے اور رائے فصیح اللہ نے یہ تمام مراحل بڑی تندہی سے طے کیے۔

رائے فصیح اللہ کے اس تحقیقی کام کی افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج کے دور میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طلباء اپنے تحقیقی مقالہ جات کی تیاری میں ان کی تحریروں سے بھرپور مدد حاصل کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق کے لیے اکثر ایسے مواد کی ضرورت ہوتی ہے جو بنیادی مآخذ (Primary Sources) پر مبنی ہو اور رائے فصیح اللہ کے کالم اور ان کی مرتب فائلیں ان طلباء کے لیے ایک مستند حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعے علمی رہنمائی کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی ذاتی لائبریری سے نایاب کتابیں اور رسائل بھی طلباء کو ادھار (مستعار) فراہم کرتے ہیں تاکہ ان کا تحقیقی سفر تشنہ نہ رہے۔ ان کی یہ علمی سخاوت اور معاونت ان کے "محسنِ ادب" ہونے کی بین ثبوت ہے۔

انہوں نے نئے اور مقامی لکھاریوں کی تربیت کے لیے جو طریقہ کار اپنایا، وہ بھی ان کی تحقیقی سوچ کا عکاس ہے۔ وہ اکثر لکھاریوں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ خیالی موضوعات کے بجائے اپنے علاقے کی تاریخ، قدیم مساجد، قدیم مدارس، مقامی اساتذہ اور علاقائی ادیبوں پر قلم اٹھائیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اس طرح نہ صرف مقامی تاریخ محفوظ ہو گی بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا علمی ذخیرہ تیار ہو جائے گا جو انہیں اپنی جڑوں سے جوڑے رکھے گا۔ ان کی اس حکمت عملی کی بدولت بہت سے ایسے موضوعات پر کام شروع ہوا جنہیں پہلے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔

مجموعی طور پر، رائے فصیح اللہ جرال کی صحافت میں تحقیق کا عنصر محض ایک جزو نہیں بلکہ ان کی تحریر کی روح ہے۔ انہوں نے گمنام ادیبوں کو زبان دے کر اور ان کے کام کو دستاویزی شکل دے کر ادب پر جو احسان کیا ہے، وہ تاریخ کا حصّہ بن چکا ہے۔ ان کے کالموں سے حاصل ہونے والی معلومات آج اکیڈمک سطح پر تحقیقی بنیادیں فراہم کر رہی ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ایک سچا صحافی اور مدیر معاشرے کی فکری تعمیر میں کس قدر دور رس اثرات مرتب کر سکتا ہے۔ ان کا یہ تحقیقی سفر آج بھی جاری ہے اور وہ مسلسل نئے لکھنے والوں اور محققین کے لیے مینارۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ روایت، علامت اور اجتماعی یادداشت کے باب میں انتظار حسین کہتے ہیں:

> "جب کسی زبان سے علامتیں گم ہونے لگتی ہیں تو وہ اس خطرے کا اعلان ہے کہ وہ معاشرہ اپنی روحانی واردات کو بھول رہا ہے، اپنی ذات کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔"(11)

حوالہ جات

۱۔ سر سید احمد خان، مقالاتِ سر سید، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۴۲۔

۲۔ شمس الرحمن فاروقی، تنقیدی افکار، شب خون پبلیکیشنز، الہٰ آباد، ص ۵۶۔

۳۔ محمد حسن عسکری، ادب اور جدید ذہن، مکتبۂ جدید، لاہور، ص ۷۸۔

۴۔ شمس الرحمن فاروقی، ادبی تنقید: اصول و مباحث، شب خون پبلیکیشنز، الہٰ آباد، ص ۶۴۔

۵۔ مولوی عبدالحق، اردو ادب اور تعلیم، اردو اکیڈمی، دہلی، ص ۳۱۔

۶۔ سر سید احمد خان، تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ، ص ۱۲۔

۷۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۹۹۔

۸۔ ”شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات“ اداریہ، گلپوش وادیاں، جلال پور جٹاں، اگست ۲۰۰۶ء، ص ۴

۹۔ ”نامے قیامت کے“ اداریہ، گلپوش وادیاں، جنوری ۲۰۰۷ء

۱۰۔ اداریہ، گلپوش وادیاں، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۴

۱۱۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۴۵